بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

پچھلی مرتبہ اشارات کے صفحات میں انتخابات کے لیے کام کرنے کے لیے جذبۂ کارکو رُوبعمل لانے کے لیے جو کچھ عرض کیا گیا تھا، وہ محض ادھوری اُمید پوری نہیں تھی بلکہ اس میں شہری اور خصوصاً دیہاتی علاقوں میں بے تکلفانہ انفرادی سطح پر کام کرنے کے جس نہج کو سامنے لایا گیا تھا۔ وہ ایسا ہے کہ مشکل ترین حالات میں بھی کامیابی کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔ بدقسمتی سے پہلے بھی کبھی ملک گیر پیمانے پر ایک بھرپور مہم اس طرح کی نہیں اُٹھائی گئی، اور اب بھی اندیشہ ہے کہ جلسوں، تقریروں، پوسٹروں اور بیانوں سے کام لینے کے دیرینہ اور نسبتۃً آسان انداز پر اکتفا کیا جائے۔ میں نے انفرادی سطح پر رابطِ عوام یا ماس کنٹکٹ کی جو لائن تجویز کی ہے اس پر اگر جلسوں، تقریروں، پوسٹروں اور بیانوں کی اجتماعی مہم کے ساتھ ساتھ بھرپور کام کیا جائے تو اس تجربے کے نتائج حیرت انگیز ہوں گے۔ کوئی بھی تحریک اور تبدیلی کا کوئی بھی پروگرام اگر ہر بار کچھ نئے انداز و اسالیب سے کام لینے کے بجائے چند آزمودہ طریقوں پر قناعت پسندانہ جمود اختیار کر لے تو وہ تھوڑا بہت حصّہ تو ضرور حاصل کر لیتا ہے مگر کوئی بڑی پیشقدمی نہیں کر سکتا۔ میری اسکیم کا خلاصہ یہ ہے کہ تمام ارکان اور کارکنان اور ہمدردانہ اسلامی ذہن کے طلبہ، کسان اور مزدور سب کے سب میدان میں نکلیں، حتیٰ کہ خواتین بھی پورا حصہ لیں اور ۱۰۰ مکمل ملاقاتیں فی کس (خواتین کے لیے نصف) ۹۰ دنوں کے لیے لازم کر دی جائیں۔ خواہ دو دو یا تین تین افراد کے وفد نکلیں اور اپنا کوٹا یکجا کر کے دو سو یا تین سو ملاقاتوں کی حد پوری کریں۔

اس تجویز پر کما حقہٗ شاید توجہ نہیں دی گئی، اور اگر موجودہ بے نیازی قائم رہی تو حالات میں کوئی بڑی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہوگا۔

پھر ایسا بھی نہیں کہ میں نے سابق اشارات لکھتے ہوئے بین الاقوامی اور ملکی حالات کی غیر معمولی پیچیدگیوں کو خارج از توجہ چھوڑ دیا ہو۔ ایسا نہیں، میں نے سارے حالات کو سامنے رکھا ہے اور اُن کے علی الرغم ایک مجاہدانہ مہم اُٹھانے سے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔
بین الاقوامی حالات پر تو براہ راست دسترس نہیں، مگر ملکی حالات کی حد تک حکومت سنجیدہ و مخلص اربابِ دین و سیاست کی مدد سے ایسے اصلاحی و انسدادی اقدامات کرسکتی ہے کہ انتخابات کے لیے فضا کو ناسازگار بنانے والے وجوہ و اسباب کم سے کم حد تک باقی رہ سکیں۔ ہو سکے تو ہمیں ملکی احوال کی اصلاح کے لیے سیاسی، فکری، صحافیانہ اور ملاقات و گفتگو کے دائروں میں محنت کرنی چاہیے۔ ہر کام جس کا نقشہ میں پیش کر رہا ہوں، اگر پوری طرح ہو جائے تو غلط عناصر کے اُبھرنے کا امکان ہی نہیں رہتا، اور اگر اس کا کچھ ضروری حصہ تکمیل پاسکے تو کم سے کم خیر کی قوتوں کو غلبہ ضرور حاصل ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے تو میں اس پروپیگنڈے سے تعرض کرنا چاہتا ہوں جو آنے والے انتخابات کے خلاف بلکہ اُن کو رکوانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے، اور جس میں بہت سے مخلص خادمانِ دین کی تعداد بھی شامل ہے۔ ہمارے نہایت ہی محترم و مخلص علماء سے لے کر اُن کے ہم خیال عوام تک یہ کہتے ہیں کہ اگر انتخابات اعلان کردہ وقت پر ہوئے تو احیائے اسلام کے اس کام کو سخت نقصان پہنچے گا جس کا ابھی آغاز ہی ہوا ہے۔ لہٰذا انتخابات کے مقابلے میں مفادِ دین کی اشد زیادہ اہمیت کا تقاضا یہ ہے کہ فی الحال انتخابات کی بحث کو لپیٹ دیا جائے۔ اس مخلصانہ پروپیگنڈے کے ساتھ جو زوردار استدلال ہے اس کی وجہ سے ہر خیر طلب آدمی تامل میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ پچھلے چند ماہ میں تو مخالفِ انتخابات فضا کا ایسا زور تھا کہ خود مجھ سے سرکاری اور غیر سرکاری، تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ جو لوگ بھی ملتے رہے، اُن کی ۸۰ فیصد تعداد انتخابات کے حق میں نہیں تھی۔ کچھ وہ تھے جو کہتے تھے کہ جی انتخابات کی یونہی باتیں ہیں، عملاً یہ ہوں گے نہیں۔ کچھ درپردہ یہ بھی کہتے رہے کہ حالات میں ایسے بگاڑ پیدا ہو جانے کا امکان ہے کہ جو التوائے انتخابات کی وجہ بن سکیں۔ کچھ وہ تھے جن کا خیال یہ تھا کہ دینی و سیاسی جماعتوں کو بار بار انتخابات کا مطالبہ کرنے کے بجائے اُلٹا اپنا اثر ڈال کر انہیں رکوانا چاہتے۔ تاکہ کچھ وقفے میں شرعی قوانین اور اسلامی مالیات اور دیگر اصلاحات کا نفاذ ہو جائے۔

بات دل کو لگتی ہے، مگر دماغ کچھ اور مسائل کو اُٹھا دیتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ موجودہ حکومت کی طرف سے احیائے دین کی سرگرمیوں کی رفتار کچھ عرصے سے دھیمی پڑ گئی ہے، اسلامی احکام و قوانین کے اجراء کے بعد عملاً اُن کے نفاذ کے لیے، یا اُن سے سرکاری یا عوامی حلقوں کو روکنے کے لیے کوئی حرکت نہیں ہوتی، جرائم اور بدعنوانیوں اور قانون شکنیوں کا دَور دَورہ اتنا بڑھ رہا ہے کہ اسلام اور اسلامی نظام اور اسلامی قانون کی تضحیک تک نوبت پہنچ رہی ہے۔ مظلوموں کی فریادیں اُوپر تک پہنچ نہیں سکتیں۔ اور نیچے والے اُن کی پروا نہیں کرتے۔ معاشی حالات ابتر اور گرانی ناقابلِ برداشت ہو رہی ہے۔ مخالفِ اسلام نظریات و تحریکات نے ہر طرف سر اُٹھانا شروع کر دیا ہے۔ یہ خرابیٔ احوال جس میں کوئی کمی نہیں آ رہی بلکہ اضافہ ہو رہا ہے، اگر اسی طرح جاری رہی تو اُس کی لہروں میں اسلام کے بارے میں اعلانات اور احکام سارے بہ جائیں گے موجودہ نظامِ حکومت کے تحت ایک مشکل یہ ہے کہ سوچنے والے عناصر موجودہ مشینری پر اثر انداز ہونے کا کوئی راستہ نہیں پاتے۔ لوگ سب کچھ دیکھتے ہیں اور اپنی جگہ گھٹ کے رہ جاتے ہیں — چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بہت مخلص مسلمان ہیں، مگر وہ اکیلے ہو کر تو کام نہیں کر سکتے۔ اُن کے ساتھ اُن کے فوجی رفقاء کی ایک کونسل ہے۔ ان کے کچھ سول وزیر و مشیر ہیں اور نیچے ایک بیوروکریسی کا طلسماتی نظام ہے۔ کوئی بھی خیال ان مختلف مراحل سے نکل کر آخر میں کیسی بھی شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے فیصلے صحیح اور مفید ہوں یا غلط اور مضر، پبلک کی نگاہوں میں ذمہ داری جنرل ضیاء الحق کے سر آتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق کے گرد آہستہ آہستہ تضادات کا ایک حلقہ بن گیا ہے۔ یہ کہنے کے لیے تو ہمارے پاس کوئی دلیلِ قاطع نہیں ہے کہ کوئی نادیدہ قوت یا کوئی حلقہ ایسا ہے جو اُن کو اس حلقے میں گھیر کر کوئی نتیجہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ مگر اتنا ہم ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ہم آپ سب حالات کی گردشوں پر اثر انداز ہونے سے معذور رہیں۔

اب اگر یہ حالت جاری رہنی ہے تو نہ اسلام کے لیے مفید ہے، نہ اُن علماء اور قائدین کے لیے جو اسلامی درد رکھتے ہوئے انتخابات کی مخالفت کرتے ہیں، اور نہ جنرل ضیاء الحق یا مجموعی طور پر مارشل لا کے لیے۔ موجودہ دَور مقبولیت اور پسندیدگی، عوام کے جس نقطۂ عروج تک پہنچا ہے، آج بہر حال اس پر نہیں ہے۔ اور نہ اُسے بحال کرنے کے لیے کوئی زوردار کام ہوتا نظر آتا ہے۔ اندریں صورت

اسلام اور جنرل محمد ضیاء الحق کے مارشل لاء اور دینی و سیاسی عناصر اور عوام کی بھلائی کا تقاضا یہی ہے کہ اس صورتِ حالات سے نکلنے کے لیے اگر انتخابات یا کسی بھی ذریعے سے دروازہ کھلتا ہو تو اس سے ضرور فائدہ اُٹھایا جائے۔

بصورت دیگر اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں مارشل لاء کی حکومت کے لیے خدانخواستہ ویسا مرحلہ نہ آجائے جیسا پہلے ایوب خاں اور پھر یحییٰ خاں کی حکومت کو پیش آیا کہ اقتدار کسی کے سر منڈھا اور بھاگو۔ یہ مرحلہ بڑا اضطراری ہوتا ہے اور بھاگتا ہوا حکمران یہ دیکھتا ہے کہ جلدی ہی جو سامنے آجائے اقبالہٗ حکومت اسی کی جھولی میں ڈال دیا جائے۔ ایسی صورت کا نتیجہ کسی انتخابی نتیجہ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ بس سب کے لیے بہتر یہ ہے کہ اضطراری لمحے کے آنے سے پہلے پہلے ہنستے ہنساتے مارشل لاء حکومت سول حکومت کی جمہوری تشکیل اپنے ہاتھوں اطمینان سے کرا دے۔

اس بحث میں ضمناً بڑے زور سے یہ نکتہ بھی اُٹھایا گیا ہے کہ آخر یہ انتخابات اپنی موجودہ شکل میں اسلام سے مطابق کب ہیں کہ اُن کے انعقاد پر زور دیا جائے۔ وہاں تو مطلوب ایک امیر اور اُس کے لیے مشیران ہیں جو عِندَ اللہِ اَتۡقٰکُم کے معیار پر پورے اُترتے ہوں۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ دلیل اس حقیقت کے ساتھ کسی معتدبہ عنصر نے اب سے پہلے کبھی نہیں اُٹھائی بلکہ اُن مواقع پر بھی کبھی نہیں اُٹھائی جو دستور سازی کی تاریخ میں اہم ترین مواقع تھے۔ ۲۲ علماء کے متفقہ دستوری نکات میں یہ موجود نہیں۔ پہلی دستوری رپورٹ کی کامیاب استردادی مہم میں اسے نہیں اُٹھایا گیا۔ دوسری دستوری رپورٹ پر مختلف مکاتیبِ فکر کے علماء نے جو متفقہ ترامیم تیار کیں اور شائع شدہ موجود ہیں، ان میں یہ شامل نہیں۔ ۱۹۶۵ء کا دستور مکمل ہوا تو اسے تمام حلقوں نے بہ حیثیت مجموعی ایک بہترین اسلامی دستور کی حیثیت سے قبول کیا۔ بعد کے دورِ ایوبی میں جب کہ انتخابی نقشہ بدل دیا گیا، انتخابات کے کسی اسلامی نقشے کو پیش کرنے کے لیے کوئی نمایاں کام نہیں ہوا۔ یحییٰ خان کے دور میں نہیں ہوا۔ بھٹو کے دور میں نہیں ہوا۔ آخر اس نکتے کو آج ہی کیوں اہمیت ملی؟

دستوری اُمور میں ہمیشہ برسوں لمبے کام کی ضرورت ہوتی ہے اور مرحلہ بہ مرحلہ خواص و عوام کے ذہن تیار کرنے کے لیے محنت جاری رہتی ہے۔ راستے میں اچانک کوئی نیا تجربہ نہیں کیا جا سکتا اور

کیا جائے تو ناکام بھی ہونا ہے اور سارے سیاسی و دستوری ماحول کو خراب بھی کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی اصولوں پر کسی انتخاب کے طریقے کے حق میں کیوں مسلسل کام نہیں کیا گیا، کوئی لٹریچر فراہم نہیں کیا گیا، کوئی متعین صورت کسی کے سامنے نہیں ہے۔ بس یہ گول مول حکم ہے کہ سامنے کا انتخاب غیر اسلامی نقشے پہ ہونے والا ہے، لہٰذا اسلام والوں کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی بلکہ اسے رکوانا اُن کا فرض ہے۔

یہ اتنا آسان معاملہ نہیں کہ بطریق فتویٰ ایک حکم دے دیا جائے، کسی مروجہ طریقے سے خواص و عوام کے ذہن کو اکھیڑنا، پھر کسی مثبت صورت پر اُن کو مطمئن کرنا ضروری کام ہے جو وقت چاہتا ہے۔ توضیح کے دور میں کیا یہ کافی ہے کہ مارشل لا کو جاری رہنے دیا جائے جس کے بہتر ہونے کا انحصار صرف اس پہ ہے کہ ایک اچھا آدمی اسے چلا رہا ہے۔ وہ اگر کسی وجہ سے نہ رہے تو کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ بعد میں بھی مارشل اپنے سابق رنگ کو برقرار رکھے گا۔

پھر مسئلہ ایک انتخابات ہی کا نہیں ہے، مالیات کے نظام کا بھی ہے۔ دفتری نظام کا بھی ہے زرعی نظام کا بھی ہے اور زندگی کے ہر شعبے کے معاملات کا ہے۔ کیا ان سب دائروں میں چلتے ہوئے نظاموں کو بیک جنبش لسان و قلم معطل و موقوف کر دیا جائے۔

کسی نظامِ رائج کو اگر آپ منہدم کرنا چاہتے ہیں تو اس کی خرابیوں کے دلائل سے قوم کو مطمئن کیجیے۔ دوسری طرف متبادل نقشہ سامنے لائیے اور اس نقشہ کو بھی قوم کے لیے قابلِ قبول بنائیے۔ اس وقفے میں جو نظام چل رہا ہو۔ اس میں تھوڑی بہت اصلاحات کر کے اس سے کام لیتے رہیے۔

حکومت اور سیاسی و دینی جماعتوں اور عوام سب کو پہلے یہ طے کر لینا چاہیے کہ انتخابات کا مقصد کیا ہے؟ اس کے ذریعے آنے والے نمائندوں سے آپ کیا کام لینا چاہتے ہیں اور وہ کیسے لوگ ہونے چاہییں۔ انتخابات کا مقصد اگر لامقصدیت ہے، یعنی جو بھی قوتیں ابھر آئیں وہ جو کچھ بھی کرنا چاہیں کریں تو پھر کسی سوچ بچار کی ضرورت نہیں ہے۔ کشتی کو چھوڑ دیجیے اور لنگر کو توڑ دیجیے۔

لیکن میرا خیال یہ ہے کہ انتخابات سے سب کا مقصد یہ ہے کہ داخلی طور پہ غلبۂ اسلام کے لیے جس کام کا آغاز ہوا ہے، وہ زیادہ بہتر طور پہ اور زیادہ اچھی رفتار سے تکمیل پائے۔ سیاسی حلقوں میں نفرت

اور تشدد پسندی اور انتقام کے جو فاسد رجحانات پھیلے ہوئے ہیں وہ ختم ہوں، جرائم اور بدعنوانیوں کا خاتمہ ہو، مجموعی طور پر ایک ایک فرد ظلم کی ہر شکل سے نجات پا جائے اور بین الاقوامی لحاظ سے پاکستان کا وقار بڑھے، اس کے معاملات میں بیرونی مداخلتوں کا سلسلہ نہ چل سکے، کوئی بھی عالمی قوت اسے اپنے تھیلے میں پڑا ہوا شکار نہ سمجھے، مسلم ممالک میں سے اسے برادرانہ رفاقت کا مقام حاصل ہو، اور وہ عالمی اسلامی وحدت اور احیائے اسلام کی مختلف تحریکوں کی پشت پناہی کا ذریعہ بنے۔

کام اگر یہ سامنے ہے تو نمائندگان اس کام کے شایانِ شان سامنے آنے چاہییں۔

لوگوں کو بلاشبہ آپ زبردستی کسی طرح ہانک نہیں سکتے، ترغیب ہی دلا سکتے ہیں۔ اور ترغیب دلانے والی دوسری قوتیں بھی ہیں جن کا ذہن اور طرح کام کرتا ہے۔ پھر متذکرہ مقصدِ انتخابات کو حاصل کرنے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے؟ صرف یہ کیا جا سکتا ہے کہ انتخابات کے لیے بہتر ماحول فراہم کیا جائے، جو وجوہ و اسباب ذہنوں میں خلل اندازی کرتے ہیں ان کا زور توڑنے کی صورتیں نکالی جائیں، اور خود انتخابی عمل میں ایسی تدابیر اختیار کی جائیں کہ خراب عناصر کو مشکل سے آگے بڑھنے کا راستہ ملے۔

اس سلسلے میں اہم اور مؤثر تدابیر عرض کی جا رہی ہیں:

انتخابات جب کبھی انتشار و اضطراب کی حالت میں منعقد ہوتے ہیں تو ان سے مثبت نتائج نہیں نکلتے، بلکہ پریشان فکر جذباتی عوام کو بہکانے کے فن کا بھی ماہر اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ عوام صبر و سکون سے نہ پارٹیوں کے منشوروں پر غور کر سکتے ہیں، نہ ملکی مسائل وضروریات پر توجہ دے سکتے ہیں اور نہ نمائندوں کے خیالات و کردار کی پرکھ کر سکتے ہیں۔ بس ایک طرح کی سرسامی کیفیت میں ووٹنگ مجنونانہ عمل کے طور پر ہوتی ہے بعد میں عوام اگر تلخ تجربات کو بھگت کر پچھتائیں بھی تو کیا ہو سکتا ہے۔ پچھلی مرتبہ مسلسل ۶ سال تک جو عذاب قوم کے سیاسی و دینی عناصر کے ساتھ ساتھ عوام نے بھگتا ہے۔ اس کا شعور اگرچہ سیاست کے مرعوبیت زدہ، غیر تعلیم یافتہ، سادہ لوح طبقوں کو نہیں ہو سکتا، مگر اس کی ایک ملک گیر ناخوشگواری کے سمّی اثر سے غیر شعوری طور پر ہر شخص نے کچھ اس انداز سے حصہ پایا ہے جیسے فضا میں کڑوے دھوئیں کے پھیل جانے پر عالم اور ان پڑھ ہر کسی کی ناک اور آنکھوں کو تلخی محسوس ہوتی ہے۔ اس تلخی کی ذمہ داری اصل ذمہ داروں نے چاہے دوسروں پر ڈالنے کی ہزار کوششیں کی ہوں مگر اس کے باوجود وہ اس کے اثرات

سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

پس انتخابات سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لیے ایک بڑی تدبیر یہ ہے کہ اضطرابی فضا کو انتخابات سے پہلے پہلے ختم کر دیا جائے یا اس کا زور زیادہ سے زیادہ امکانی حد تک توڑ دیا جائے۔

سب سے بڑا مسئلہ اس حالتِ خوف کا ہے جس میں عوام جرائم اور بدعنوانیوں کے اس طوفان کی وجہ سے گھرے ہوئے ہیں جو مارشل لا کی آمد پر ابتداءً تو ذرا سے کم ہوئے تھے، پھر بڑھنے لگے، اور اب اسلامی قوانین کے اجرا کے اعلان کے بعد تو خاصے زور پر ہیں۔ جانیں، مال، عزتیں اور آزادیاں محفوظ نہیں ہیں۔ انتظامیہ اور پولیس سے کما حقہ مدد نہیں ملتی بلکہ کبھی تو کوتوال الٹا مجرم کی حمایت کرتا ہے اور جرم کا نشانہ بننے والوں کو اپنے عتاب کا نشانہ بھی بنا لیتا ہے۔ دفتری نظام کے ذریعے دادرسی انتہائی مشکل ہو گئی ہے۔ شریف لوگ جائز حقوق حاصل نہیں کر سکتے اور تیز طرار عناصر ناجائز مفاد اٹھا لیتے ہیں۔ لوگ درخواست گزاری کے چکر سے ڈرتے ہیں اور اگر کوئی قضیہ سر آ پڑے تو درخواستیں لیے دفتر بدفتر اور میز بہ میز گھومتے ہیں مگر درخواستوں کو پہیے لگائے بغیر کام نہیں نکلتا۔

اس صورتِ حالات کو سمجھنے کے لیے محکموں اور اداروں کی تفصیلی رپورٹوں میں ڈوبنے کی ضرورت نہیں، آپ کسی ایک ہفتہ کے دو تین محتاط اور سنجیدہ اخبار اٹھا کر دیکھ لیجیے، جرم اور خیانت کے واقعات کی رپورٹیں جمع کر کے اگر ان کا صرف ۵۰ فیصد حصہ بھی درست تسلیم کیا جائے تو موجودہ معاشرے میں زندگی ایک بڑی آزمائش ہے۔ معاشرے نے پچھلے چند برسوں میں گویا مجبور ہو کر جرم اور خیانت کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور ہر کوئی بڑی حد تک تن بہ تقدیر ہو گیا ہے کہ جو کچھ سر آئے گی اسے بھگتنا ہوگا۔

جرم اور خیانت کی منحوس قوتوں کے خلاف اگر ہماری حکومت کوئی مؤثر لڑائی لڑنے پر تیار ہو تو اس کے لیے تدابیر و تجاویز بہت ہو سکتی ہیں، لیکن اصول یہ ہونا چاہیے کہ جہاں کہیں اس طرح کا کوئی واقعہ نمودار ہو بالاتر قوتوں کی توجہ اپنے مقامی کارکنوں پر مرتکز ہو جائیں کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہر درخواست دہندہ اور شکایت کنندہ اور نقصان میں آنے والے فریادی کی پکار پر پوری انتظامیہ کو توجہ دینی چاہیے، اور کوئی باز پرس کا نظام ہونا چاہیے کہ کسی درخواست پر دو ہفتہ میں کیا کارروائی ہوئی۔ (باقی)